آبلے

www.HallaGulla.com

احمد ندیم قاسمی

بہت پیارے

گلزار کے نام

جو فلمی ہدایتکاری، گیت

نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر

فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک

بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

Virtual Home for Real People

ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی طبعیت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ رہے لیکن کچھ دنوں سے بڑھاپا اس پر اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا اور اس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ بنارسی پگڑیوں، ریشمی لنگیوں اور بوسکی کے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے چولوں کی جگہ ململ کی پھنٹیوں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسی کسائی بنگالی قمیصوں نے لے لی۔ چہرے کی لالی نچڑ گئی اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے ٹانگیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری بلکہ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ جب وہ گلی کے نکڑ پر تیزی سے گزرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا۔

''ارے بھئی وہ تو پنگھٹ پر جا چکی۔'' یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گھبرو کو دبکتا دیکھ کر پکار اٹھتا۔ ''آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے۔'' تو لوگ بے اختیار ہنستے، اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا۔

''شمشیر چچا نہ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کٹورے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک رہی ہیں پربت پر سے۔ اور پھر نہ تمہاری آنکھیں چمکتی ہیں۔ نہ چہرہ دمکتا ہے تم ہنستے ہو تو تمہارے پپڑائے ہونٹوں سے خون رِسنے لگتا ہے۔ تمہارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو ہو جاتی ہیں۔ آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا۔''

پربت کی چوٹی سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا اور وہ کہتا۔ ''یعنی مطلب یہ ہے کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں۔ اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لودیتی پتلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔۔۔۔! اور بھئی یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگاؤ۔۔۔۔ کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا، اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں۔۔۔۔۔'' اور چٹانوں کا ایک ریلا گڑگڑاتا ہوا اُمڈ پڑتا۔

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے، انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خان کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیئے تھے، وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور محبت کا نتیجہ تھے۔ اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا، تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا۔

''دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے۔''

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی، مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ طاق پر سے ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی۔

''کیا بات ہے ابا؟''

اور وہ جھنجھلا کر بولا۔

''ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟'' اور اس نے دیا بجھا کر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے، اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے۔ اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب اس کے بچے ہونے لگیں گے۔ اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اجڑتی جاتی تھیں۔ ان لوگوں پر اسے بہت ترس آتا تھا۔ جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں جو ہمیشہ کے محتاج رہتے تھے، بارشوں کے لئے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے اور مایوس ہو کر گالیاں دیتے تھے، لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دریا سمٹ اور ہٹ کر بہت دور بھرے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا، چٹخی ہوئی شور زمینوں پر جب مڑکا اِکا دُکا پودا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگر ان دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

''کچھ سمجھ میں آتا۔'' اس نے ایک روز ذیلدار سے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔'' کچھ پلے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمین کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے؟ بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے۔ خدا کی ان نعمتوں میں ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے۔ دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار۔''

''شمشیر خاں، سرکار جو چاہے کرے۔ چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھل کر نہیں کیا کرو۔ سرکار کو پتہ چلا تو دھر لئے جاؤ گے اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے۔''

''مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے۔'' وہ حیران ہو کہتا۔

''سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے۔'' ذیلدار حسبِ عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رو چلنے لگتی۔

''ہوا پر بھی لگان؟ سچ مچ بھئی اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگا دے تو عجیب تڑک پھڑک شروع ہو جائے۔ ہر پل واویلا مچا رہے۔ اور بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ کچھ نہیں بھئی، ادھر اس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے۔ سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں۔ پانسو کے نوٹ

دے کر میرا سی کو شہر بجھوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے۔۔۔۔۔۔۔۔ہائے ہائے ہائے!اور پھر ذیلدار۔۔۔ایک بات کہوں۔۔۔یہ سامنے دادا شہباز ہ ءنا، ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔''

'' کیوں؟'' کوئی سوال کرتا۔

''ایک تو غریب ہے۔صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے،اور پھر دمہ کا مریض ہے،ادھر دادا شہباز انا للہ ہوئے۔۔۔۔۔کیوں دادا؟''

دادا شہباز پنشنر جو بڑھاپے کے آخر نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا، پوپلے منہ کو کھجا کر کہتا۔

''ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے،اور اسے چھپا دیں گے اسے کوڑے کے ڈھیر میں۔جب بھی ہوا نہ ملی تو کوڑا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا پھیپھڑے بھر لئے،اور پھر مٹکا بند۔۔۔۔۔۔تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔کنکوا رکھ دینا۔۔۔ہاں۔''

''ابے آرام سے کھانس۔۔۔۔ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے۔''

''ابے حقہ ادھر گھما۔جورو کی طرح لپٹ جاتا ہے اس سے۔۔۔۔'' ''ابے سنبھل کر بیٹھ تو نے تو دکان کھول رکھی ہے۔۔۔!

مگر جب وہ گھر آتا تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اس کے کمرے میں کسی جھری کے رستے آنکلتا اور اندھیرے میں سوکھے پنجے اس کی طرف لپکتے،اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔''

''دیا بجھا دو دلیر۔'' وہ پکار اٹھتا۔تیل ضائع ہو رہا ہے۔۔۔۔'' اپنی ہی آواز سن کر وہ چونک اٹھتا۔آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا کہ شائد کسی کونے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو،اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا۔۔۔۔۔صبح کو اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

''یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔'' اس نے ایک روز سوچا،اور بنارسی پگڑی اتار کر پلنگ پر پٹخ دی۔اس کے بعد ہر روز سفیدی بوقلمونی کی جگہ لیتی گئی اور لوگ حیران ہونے لگے کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک پہاڑ کی طرح کیوں ٹوٹ پڑا۔

ایک روز پٹواری نے چوپال پر آکر خبر دی کہ انگریز نے جرمن کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے،کمزور قوموں کی حفاظت کے لئے ۔شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔خلاف معمول اتنے بڑے واقعہ پر خیال آرائی نہ کی بلکہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔چہرے پر کئی رنگ آئے گئے ،اور پھر آ گئے۔۔۔۔آخر اٹھا،لپک کر گھر آیا،اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا۔

''لام چھڑ گئی ہے۔تو نے تو اس روز کہا تھا کہ انگیریزوں کا چھتری والا وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی ڈور دھوپ کر رہا ہے۔تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔شکر ہے تو نے مڈل تو پاس کر لیا۔ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کر دیتے،تو بات یہ ہے دلیر بیٹا۔''

اس نے ہزار چاہا کہ اعصاب کو قابو میں رکھے،اس کا رنگ نہ بدلے،اس کے ہونٹ نہ کانپیں،اس کی بھویں نہ لرزیں۔مگر اس وقت اس کی ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ایک دم رک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا،اور پھر یوں بولا جیسے اس نے سارے عبارت برسوں سے رٹ رکھی ے تھی۔۔۔۔۔۔!

''بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا، وہ واپس آ کر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولیس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں جو بات کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں۔۔۔۔۔تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوانمردوں کا کام نہیں۔ یہ گھڑی تو مقرر ہے ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ جنگ کے طوفان میں سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں اور کڑوروں کچا خربوزہ کھا کر ہاچربی کا حلوہ کا ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں۔ چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے۔ تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا ہوں کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے۔ لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں۔ یقین جانو، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں۔ دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔''

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہد۔ دوگھوڑا بوسکی کی قمیص، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا سبک سا بید، کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹخ پخ۔ غرض ہر بات سے متاثر تھا اور یہ تاثرات اس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی نسواری مٹھائیوں کے چکر میں آ کر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چلی تھی۔ ساتھ ہی اسے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پر حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی، اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تالاب سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھولاتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی۔ اسکی چوڑیوں کے چھنا کے میں ترنم تھا۔ وہ قدم اٹھاتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں پڑے گا، اور وہ ابھر جائے گی اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جا رہی تھی۔

شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان سا خم کھا جاتا تھا اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھتی تھی۔ دلیر خاں کے نزدیک اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلان جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں نے خالی ہونا شروع ہوا اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں۔ تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آب حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

دلیر خان کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی۔ ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے۔ برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں۔ آنگن میں کوؤں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا۔ زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہو گیا۔ آنکھوں میں بھولے سے سرمہ پڑتا بھی تو دن ڈھلے تک بہہ جاتا۔ شمشیر اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتا مگر جانتا تھا کہ جوانی میں محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر شاداں تو ویسے ہی مجبور ہے۔ اسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہیے۔۔۔لیکن یہ اداسی، یہ آنسو، یہ جمائیاں۔۔۔۔!

''شاداں بیٹی، یہ براشگون ہے، جوانمردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر پڑے نہیں رہ سکتے۔ خدا کیلئے ہنس کھیل مسکرا۔ سنتی ہے شاداں بیٹی؟''

شاداں شمشیر کی طرف دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو ''ٹھیک ہے، ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں مگر کس سے ہنسوں؟ کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو۔ تم کیا جانو؟''

شمشیر سب کچھ جانتا تھا۔ وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا۔ ''آج پھر خط آیا ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ ''لکھتا ہے، شاداں سے کہیے کہ میرے لیے دعا کیا کرے۔ اداس نہ رہے۔ گرج کڑک اور دھواں دھار طوفان کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے۔ سورج بھی چمکتا ہے۔ ہری بھری گھاس بھی اگتی ہے۔۔۔'' شاداں کو کبھی کبھی شک گزرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے۔ آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گزارے تھے اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی براسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں۔ اسے تو ماہیے، ڈھولے، ٹپے اور دوہے کے سوا اور کچھ نہیں معلوم۔ یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

ادھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھومنے لگے تھے۔ مگر ان سب میں شیر خان اسے ایسا بھایا کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

''اور اگر لڑکی ہوئی؟'' کسی نے پوچھا۔

''تو شیرنی۔'' شمشیر نے جواب دیا۔

''میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی؟ تو؟'' دادا شہباز نے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

''عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا؟''

''ہاں ہاں۔''

''کیا؟''

''یہی لنگور، گیدڑ، بندر۔''

لوگ سنجیدہ ہو گئے۔ کیونکہ موضوع عام نہیں تھا بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا۔ اور شہباز حسب عادت زیادتی پر اتر آیا تھا۔ مگر شمشیر نے کہا۔

''بھئی چچا مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہیے۔ یہ کیا ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا کہ ہم مذاق کر رہے تھے۔''

''منشی جی سے پوچھ لو۔'' دادا شہباز ہار کب مانتا تھا۔ ''امرت سر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے۔ زندہ ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ ماں کا دودھ پیتا ہے۔ البتہ دم ذرا چھوٹی ہے۔''

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا۔ مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے۔ جب اس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا۔

''خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ۔'' اب آ بھی جاؤ نا۔''

اور جب بچہ پیدا ہوتو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، موٹا سر، گول چہرہ گورا رنگ۔'' ''ہے دادا شہباز۔'' مارے خوشی کے اس کے گلے سے اکھٹی آٹھ دس آوازیں نکل گئیں۔'' سنتے ہو شیر پیدا ہوا ہے شیر۔''

''چچ چچ چچ۔'' دادا شہباز نے ہمدردی کی۔'' ہائے ہائے ہائے۔ انسان کے گھر میں حیوان تیرے کھیل نیارے ہیں رے مولا۔ لڑکی ہی ہوتی۔ پر یہ شیر یہ دم والا شیر، شمشیر میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟''

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا۔ ننھا دکھایا اور پھر اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا۔'' سیدھی طرح مبارک دے ۔ورنہ دوسری ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا۔''

شہباز چوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا۔۔۔۔!

''ہم سولہ سترہ روپے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے۔ مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چر گئیں تو وارے نیارے ہیں ہمارے۔ جانہیں دیتے مبارک۔۔۔'' اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دلیرا ابھی جھانسی ہی میں تھا کہ اسے اپنے باپ بن جانے کی اطلاع ملی۔ فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گھٹڑی پارسل بھجوادی۔ ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

ادھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں بدلنے لگیں اور اس کی حس مزاح تیز ہونے لگی۔ اب اسے ہر مہینے بیٹے کی طرف سے بیس روپے مل جاتے تھے اور وہ ہر روز مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہتا تھا۔

''بس ایک سال چاچا۔۔۔ ایک ایک کوڑی چکا دوں گا۔۔۔ دیکھئیو وہ جو جو تم پچاس پچاس کے پانسو اور ہزار ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا۔ میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں۔

مہاجن ہنستا، یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں چمکتی پھر گالوں کے انبار میں ہونٹوں کا شگاف ہوتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا۔ پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی۔ سانسوں میں کشتیاں ہوتیں اور قہقہہ کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا۔ اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا۔

''بڑے پاپی ہو تم۔''

شمشیر خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے۔ چربی کی ایک تہ سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ابھرتا ہے مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے تو بھٹک جاتا ہے۔ ایک حصہ نتھنوں اور دوسرا منہ کے راستے باہر نکلتا ہے۔ تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹ جاتا ہے۔ اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے۔۔۔۔!

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اس کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کی ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی

تھی۔لال لانبی پوتھیوں کے ٹاکروں میں سیاہ روشنی کی ننھی ننھی بندیاں کئی گھروندوں کی تباہی کی ضامن تھیں۔اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان بندیوں میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔اور پھر وہ نہایت سبک سے چاقو کی کھرچنی اور وہ گھسا ہوا موم اور۔''ہرے رام ہرے رام۔''

ایک روز شمشیر خان کو دلیر کا خط ملا کہ اگرچہ وہ ننھے شیر خان کو دیکھنے کے لیے حد سے زیادہ بے تاب ہے مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کیلئے آج کل کراچی میں ہے۔وہاں سے باقاعدہ خطوط لکھتا رہے گا۔چند روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا کہ دلیر سمندر پار کر چکا ہے اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے۔شمشیر کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا اور لوگوں پر اسے بہت رحم آتا تھا جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

''کچھ سنا شمشیر خاں۔''ایک روز پٹواری نے اسے ایک خبر سنائی۔''دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے۔اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

''دس دن میں سارے فرانس پر قبضہ۔۔۔''شمشیر بولا۔''حلوے کی طرح نگل گیا کم بخت۔''

''فرانس ہے بھی حلوہ۔۔۔''دادا شہباز چہکا۔''میٹھا میٹھا، تر و تازہ، رنگ برنگا۔''

''یہ فرانس کہیں دور ہے نا منشی جی۔کراچی سے کوئی جہاز اگر ۱۱ جون کو چلے تو ۲۲ جون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟''

اسے تسلی دی گئی کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہوگا۔مگر اب ہر روز پٹواری اسے ایک وحشت ناک خبر سناتا اور اس کے چہرے پر جھریاں پھر سے ابھرنے لگتیں۔

''انگلستان پر ہر روز تڑا تڑ حملے ہو رہے ہیں۔مکان جل رہے ہیں۔عمارتیں گر رہی ہیں۔ملبے کے نیچے عورتوں اور بوڑھوں، بچوں کی لاشیں اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے۔۔۔!''

''بھئی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ایک سادہ دہقان نے حقے کے لئے تمباکو مسلتے ہوئے کہا۔''انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟''

شمشیر کو جہ بہلاوے کے لئے ایک موضوع ہاتھ آ گیا۔

''نہیں۔۔۔نہیں میرے عزیز۔انگریز کہاں مرتا ہے۔انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ ہے۔ساگوان کا شہتیر ہے۔فولاد کا ڈھانچہ ہے۔میرے بھائی۔انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے۔فرق صرف اتنا ہے نا کہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا سانولے ہیں۔اس کے پاس جہاز ہیں ہمارے پاس اونٹ۔اور کے پاس بندوقیں ہیں، ہمارے پاس لاٹھیاں۔اسکے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی۔جس میں اس کا ننھا سا بچہ گر کر اللہ میاں کے ہاں سدھار گیا تھا بیچارہ۔اور پھر انگریز کے پاس چرچل ہے اور ہمارے پاس دادا شہباز، جو آوے کا ڈھلانی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے۔اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں سے سرکاری سڑک گزرنے والی ہے۔''

اور پھر پٹواری نے ہر روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔''آج گاندھی جی نے ہر انگریز سے اپیل کی ہے وہ جرمنوں پر

اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ اور اس نے کسی قسم کا لین دین نہ کرے۔ جرمن خود ہی تنگ آ کر واپس جرمنی چلے جائیں گے۔''

''واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دور بلائیں۔'' شمشیر حاشیہ آرائی کرتا۔''

دشمن کے ایک چٹکی تک نہ لو، تو پھر دشمنی کاہے کی۔ دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ جماؤ تالو پر کہ بھرکس نکل جائے۔ ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے تکلے پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے۔''

''دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔۔۔'' دادا شہباز نے کہا۔ ''اور ادھر سے حکم ملتا ہے کھڈیاں بناؤ۔''

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ ٹوکے، ''تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کئے ہیں دادا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے ہوں۔''

''اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو؟''

''یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو۔''

''اور یہ چرخہ چلاؤ؟''

''یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو، ہتھی دے مارو کلے پر۔''

''لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟''

''اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا۔۔۔ ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر؟''

انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا، زبردستی۔''

''یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی!''

چوپال پر گپوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک پرانے شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا، مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا، دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا۔ پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا، اور جب کہیں چین میسر نہ آتا تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا۔

انہیں دنوں دلیر کا خط آیا کہ اب وہ مصر میں ہے اور خوب مزے میں ہے۔ اور مصری اذان بڑی سریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں سیریں کرتے ہیں اور۔۔۔ ''یعنی جنگ کا ذکر نہ تھا۔ شاداں نے یہ سنا تو شیر کو اچھالتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی اور شمشر کا خط دوبارہ سہ بارہ پڑھوانے کے لئے پٹواری خانے کے چکر کاٹنے لگا۔

''اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا۔'' ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔ ''سمالی لینڈ مصر کے قریبی واقعہ ہے۔''

''ارے۔''

''ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں کا!۔''

''خدا کی پناہ یعنی ٹڈی دِل ہوا جہازوں کا۔''

اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا گاؤں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ چپ چاپ چوپال پر سے اٹھ کر گھر کو چل دیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے صندوق کھولا اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا۔ شاداں بھاگی آئی تو شمشیر بولا۔

''نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔ دعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے۔ اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے۔ رو رو کر، بلک بلک کر سسک سسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج کہ میں نے قرض اتارنے کے لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ میں جھونک دیا۔ یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا۔ یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔ یہ نہ سوچا کہ۔۔۔۔۔'' اس کا گلہ رندھ گیا اور سر کو تکیئے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں مچل گئی۔ شیر کو فرش پر بیٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔

'' میرے چچا، کچھ بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟ کچھ تو کہو۔''

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا۔

''دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے۔ اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی تڑ تڑ اور گرد و غبار اور دھواں اور دھائیں دھائیں۔۔۔۔ میرا نازوں سے پالا دلیر، میری حرص کا شکار دلیر۔ میرے دلیر میرے۔۔۔۔۔'' وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں۔ مزاروں پر دیئے جلے۔ بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا۔ بکرے قربان ہوئے۔ دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا۔ کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسماً تھوپ تھاپ کر الگنی پر ڈال دیئے جاتے۔ شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبریں بہت ہیں۔ پر اگر چچا شمشیر نہ ہو تو بات کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ اسے آنے دو۔''

مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔۔۔۔ وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی زخم آئے اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب انڈیا آنے والا ہے۔

''انڈیا؟'' اس نے پٹواری سے پوچھا۔

ہاں۔۔۔۔ یعنی ہندوستان۔

''یہ انگریزی ہے؟''

''ہاں۔''

''یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟''

''یہی معلوم ہوتا ہے۔''

''ارے شاداں بیٹی۔۔۔۔'' وہ گھر آ کر پکارا۔۔۔۔'' کچھ سنا۔۔۔۔دلیر انگریزی بھی بولنے لگا۔۔۔۔اور اب واپس آ رہا ہے۔۔۔۔اور دیکھ۔۔۔۔۔وہ مرغی پھر رہی ہے نا وہ گوری سی بانجھ، کم بخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک انڈا برآمد کرتی ہے۔اسے ذبح کرا لے اور ساتھ ہی گورمکھ کی دکان سے جوشی چاول لے آ۔۔۔اور دیکھ، بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔''

باہر گلی میں آ کر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا۔

''ارے طرے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے بات سن۔پگڑی کو اتنی کلف نہیں لگانی چاہئیکہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے۔''

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا۔

''جنگل کی کوئی نئی خبر؟'' اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی تروتازہ خبر ہو بھئی۔ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے۔۔۔۔۔۔نہ نہ، بہت ہو چکی یہ باتیں۔کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی کہ اوسانوں کو ٹھکانہ ملے۔''

دادا شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نخسے کے اجزاء پوچھ رہا تھا، یکا یک چونکا اور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔

'' کیا کہا میاں شمشیر، ہائے ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے قرآن کی قسم۔۔۔۔ارے تمہارا دلیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ٹیلے کی خبر سنتے تھے اور اب تمہارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو وہی ہوتی ہے نا جس میں ان گنت انسان کھیت رہیں اور میاں شمشیر، جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کے لئے جان دیں گے، ان کے بھی تو باپ ہوں گے، ان کی بھی تو نئی نئی نویلی بیویاں ہوں گی۔اور معصوم بچے اور پیارے دوست، اور ہمدرد رشتہ دار۔ان کی امیدیں اور ان کے حوصلے۔چاہے وہ جرمن کے ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔''

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔مٹی ہوئی جھریاں پھر سے ابھر آئیں۔پہلو بدلا، اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو چچا۔۔۔'' اس کی آواز کھوکھلی تھی اور بج رہی تھی اور اس میں گھبراہٹ کے اتار چڑھاؤ تھے۔''میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی کہ۔۔۔۔بات یہ ہے دادا، کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''میں نے غلط بات کب کہی ہے؟'' شہباز الجھ رہا تھا۔

''صرف اب۔''شمشیر موضوع کی بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے۔

''میرا مطلب ہے، میں نے کبھی نہیں کہی۔۔۔''

''سچ بات۔''شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھی۔

مگر شہباز اپنے حساسات کی تلخی سے ابھی پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا، بولا۔

''تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔شمشیر اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے۔پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور سچ کہتا ہوں۔دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔اندھیری گرجتی دھاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں اور ٹھوکریں کھا کر اگر ابھی تو لاشوں پر۔کسی کی انتڑیاں باہر پڑی تھیں۔کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا تھا۔کسی کی ٹانگیں غائب ہیں، کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا۔کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا۔میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی۔جرمن سپاہی تھا۔اتنا خوبصورت تھا کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے۔میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں اور ایک مڑی تڑی تصویر۔۔۔ایک لڑکی کی۔۔۔۔جس کی آنکھیں اتنی گھمبیر تھیں۔قرآن کی قسم کہ جہاں ڈوب جائے اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں۔

''سچ مچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟''میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔میں نے تینوں چیزیں اس کی جیب میں ڈال دیں۔اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر، میری بات سننا، میں سچ کہتا ہوں، میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں اور اس کے نیلے ہونٹ اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر سنوارنے لگیں۔۔یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لئے مرا۔۔۔اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔۔۔یہ سات ٹھیکریاں۔۔۔۔یہ سات لعنتیں۔۔۔۔۔''

دادا شہباز کی آواز بھرا گئی اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اتر گیا۔

''دادا۔''شمشیر نے اسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا۔

''میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے جانے دو۔''

''دادا۔''شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا۔اور پھر سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ایک مجرم کی طرح شرمندہ اور نڈھال۔۔۔جیسے دنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وہی ہو۔

صبح کو اٹھا تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اس کا احساس مسرت پھر سے جاگ اٹھا اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں۔

''دلیر آرہا ہے۔۔۔دلیر مصر سے بخیریت آرہا ہے۔''اس کی ذاتی تسلی کے لئے یہی خیال کافی تھا اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں۔''اور میں پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔''بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے۔اس نے پوچھا۔

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے۔اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا۔یعنی دلیر آرہا ہے،تو آکر واپس بھی تو جائے گا۔اور جنگ سے انسانا یک مرتبہ بچ نکلے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز! قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبانکے۔۔۔۔۔بات کیا تھی اور تو نے کہاں پہنچادی!

اس نے بہت کوشش کی مسکرائے،قہقہے لگائے،پھبتیاں کسے،مگر اس ذہن کے پراچانک ایک خوبصورت چہرہ ابھرتا اور پھر نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں،اور کلیجے میں کرچے سنگین پیوست ہو جاتی اور انتڑیاں باہر ابل پڑتیں۔وہ شاداں سے کہتا۔

''بیٹی کوئی بات سناؤ۔۔۔''مگر وہ مسکرا کے پیاز کاٹنے لگتی''

''ارے بھئی کوئی بات سناؤ''۔۔۔۔''وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا۔

''دلیر کب آئے گا؟''سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

''دادا کوئی بات سناؤ۔۔۔۔۔''اس نے چرکے لگانے والے شہباز سے مرہم کی التجا کی۔

''بات؟''بڈھے نے پوچھا۔''یعنی کوئی بہت بڑی خبر؟''

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر ببول میں پھینک آئے۔

چند روز بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔کراچی اترتے ہی اس کی رجمنٹ رنگون چلی جائے گی اور رنگون سے سنگاپور جانے کا قصد ہے۔

''دلیر نہیں آرہا۔۔۔۔۔''ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے،اور شاداں جو مصالحہ رگڑ رہی تھی دم بخود ہو کر رہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''دلیر نہیں آرہا،وہ رنگون جارہا ہے۔''اس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے چوپال پر اعلان کیا۔

''بہت بری خبر ہے بھئی۔''دادا شہباز کی لے ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔

شمشیر بگڑ گیا۔

''دیکھو دادا،بہت لحاظ کیا تمہارا،۔تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔یہ اچھی بات نہیں۔میں تمہارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ۔۔۔۔''اور وہ غصے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اٹھا آیا۔

پٹواری نے آواز دی۔

''جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا''

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا،جیسے بس چلے تو اس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے۔

لیکن اسی روز ایک شہباز پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا۔ شاداں تک کو گھرک دیا۔

''لوہے کی زبان ہوتی تو شائد مرچیں اثر نہ کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا فتیلہ رکھ دیا ہے تمہارے سالن نے ۔۔۔۔ بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں۔ کفگیر جما دو کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر۔۔۔۔۔۔ لے جاؤ، میں نہیں کھاؤں گا۔''

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھلتا گیا۔ اس کا بیٹا رنگون میں تھا اور اس کے خیال میں یہ ناممکن تھا کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی زقند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے۔ ''مشرق میں کیا پڑا ہے۔'' پٹواری نے کہا تھا۔ ''مشرق کے لئے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں کہ اب یہ تکلف بھی کیا جائے۔''

''ایک جاپان ہے۔'' دادا شہباز نے جہاندیدہ سیاست دان کے انداز میں کہا تھا۔ ''سو گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ برسوں سے سر پٹخ رہا ہے، پر یہ افیمی ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے۔ ادھر بچے کے ہاتھ میں آئے ادھر دانت نکال بیٹھے۔ اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک تا گا لٹک آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں۔ اور ان کے سپاہی ٹھنگنے ناٹے۔ تم یوں جما کر ان کی کھوپڑی پر تھپڑ پر مارو تو زمیں

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People